غلام ربانی تاباں

ساز لرزاں

سازِ لرزاں

ساز لرزاں

غلام ربّانی تاباں

انڈین لٹریچر سوسائٹی

جامعہ نگر، دہلی

بار اوّل ۱۰۰۰

قیمت عمر

فہرست

ایشیائی تحریک آزادی کے نام

تاباںؔ

تاباں اپنی شاعری کا آغاز روایت سے کرتے ہیں یعنی "ساتھ اُن کے رونقِ بزمِ شبستانی گئی"، اور "گُل افشانی گئی"، "نغمہ سامانی گئی"، "غزل خوانی گئی"، وغیرہ وغیرہ لیکن اگر وہ اپنی شاعری کو اسی حسین روایت تک محدود رکھتے تو دیوان تو جب بھی اُن کا چھپتا اور شاید مقبول بھی ہوتا کیونکہ جوان محبت کا جذبہ پٹرول کی طرح رقیق ہوتا ہے ذرا سی چنگاری دکھانے سے بھڑک اُٹھتا ہے۔ اس دیوان میں ایسی چنگاریاں بہت ہیں اور جذباتِ محبت بھی کہیں کہیں بھک سے اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

"آبِ رواں میں جیسے شعلے مچل رہے تھے
سینوں میں بُلبُلوں کے دیپک سے جل رہے تھے"

"ماہ وش۔ شعلہ جبیں۔ رنگیں قبا
کیف پرور۔ دلنواز و جانفزا"

"گال دمکتے کُندن جیسے آنکھوں سے مے ڈھلتی ہے
کافر گیسو دوش پہ بکھرے مست ادا سے چلتی ہے"

"پنچم تانوں سے سینے میں دیپک جلتے جاتے ہیں
نغموں کے سانچے میں جیسے شعلے ڈھلتے جاتے ہیں"

"وہ رات ہم نے جو فردوس سے چُرائی تھی
مہ و نجوم کی تنویر سے سجائی تھی"

یہ شعلۂ و شراب کی شاعری جس سے سینے میں دیپک جلتے ہیں بڑی ہی حسین اور کیف پرور شئے ہے۔ یہ رات محبت کی جو ہمیشہ فردوس سے چُرائی جاتی ہے آج سے پہلے بھی لاکھ بار حسین معلوم ہوتی رہی ہے۔ آج سے لاکھ بار بعد بھی اتنی ہی حسین اور گداز معلوم ہوگی اس لئے اس قسم کی جوان اور دہکتی ہوئی شاعری بھی جنسی جذبے کے صحت مند اظہار کے لئے بڑی سُندر معلوم ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کیا اس کے آگے بھی شاعری کی کوئی دُنیا ہے کہ نہیں ؟ کیا شاعر کا موضوع سخن اس آدھی حقیقت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا ؟ کیونکہ آدھی حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ "سینے میں دیپک جلتے جاتے ہیں" لیکن باقی حقیقت یہ ہے کہ سینے کی اس جلن کے بعد مُنھ سے کاربن ڈائی اکسائیڈ کے بھپارے نکلتے ہیں۔ پہلی رات فردوس کی رات ہوتی ہے، دوسری رات فاقے لگتے ہیں، تیسری رات آدمی اگر ذہین ہو تو انقلابی بن جاتا ہے ورنہ خودکشی اختیار کرتا ہے۔ تاباںؔ اس لحاظ سے بڑے ذہین واقع ہوئے ہیں شروع شروع میں اُن کی شاعری محبت کے لطیف اور شاداب احساس سے رچی ہوئی تھی۔

"وہ چاندنی۔ لبِ دریا۔ سکوت تنہائی
فضا سے ڈھلتی ہوئی جنتوں کی رعنائی
رسیلے فرش پہ وہ کہکشاں کی چھاؤں میں
نشاط و کیف و محبت کی بزم آرائی"

"رات اپنی ہے مری جان سحر ہو کہ نہ ہو
پھر کوئی لمحہ محبت کا بسر ہو کہ نہ ہو
اور خوبارِ طرب شعلۂ تر ہو کہ نہ ہو"

اردو شاعری کے عاشق کو کل کا اعتبار نہیں ہے۔ جانے کل کیا ہو۔ آج کے ایک لمحہ میں ساری جنت گھول کر پی جانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک ناممکن اَمر ہے اور اس مفروضے کی جب تکذیب ہوتی ہے تو عاشق کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے پھر کل افلاک، رقیب اور محبوب کے شکوے ہوتے ہیں۔ شربتِ وصل کا یوں ذکر کیا جاتا ہے جیسے محبوب لیمن اسکوائش کا ایک گلاس ہو جسے غٹا غٹ پی کے خالی کیا جا سکتا ہے یعنی چاہت ایک ایسا جذبہ سمجھا جاتا ہے، جو ایک انسان اور ایک شئے کے درمیان ہوتا ہے ایک انسان اور ایک انسان کے درمیان نہیں۔

تاباں نے بہت جلد اور بڑی ہوشیاری سے اس پرانی روایتی شاعری سے نجات پالی گو انھیں ایسا کرنے کے لیے بہت سی دشوار گذار منزلوں میں سے گزرنا پڑا ہے،

محبت اپنے ساتھ غم لائی اور تاباںؔ کو معلوم ہوا ؎

"حسین رات محبت کی شادمانی کی

وہ ابتدا تھی مری دُکھ بھری کہانی کی"

عرصہ تک شاعر اس دکھ کو سُناتا رہا۔ اپنے محبوب کو، محبوب نہ ملا تو در و دیوار کو،

در و دیوار نہ ملے تو کہساروں اور صحراؤں کو سُناتا رہا۔

"نہ اب خرد کا ہوش ہے نہ کچھ جنوں کا پاس ہے

بلند و پست زندگی پہ چھائی جا رہی ہے وہ"

"اور اس خوابِ محبت کی بھیانک تعبیر

ایک ٹوٹا ہوا دل سوز کا پگھلایا ہوا

غم کا مارا ہوا آلام کا تڑپایا ہوا"

زندگی بھٹکی ہوئی ہے آرزو گمراہ ہے"

"اے غمِ دل مری حالت پہ مجھے رہنے دے

بحرِ ذخارِ محبت میں یونہی بہنے دے"

"تیری نظروں میں ہے تاریک ضیائے خورشید

منظرِ لالہ و گل۔ خارِ نظر ہے وہ بھی"

"جانے یہ کون سا عالم ہے کہ دل میں تاباںؔ زیست تو زیست ہے اب موت کا ارماں بھی نہیں"

ان تمام اشعار میں شاعر نے محبت کی محرومی اور ایک فرد کے غم کو بڑی اہمیت دی ہے یہ غم بھی اہم ہے اور اس کی مریضانہ کشش سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی شاعر اپنے غم میں وہ لذّت محسوس کرتا ہے جیسے اُسے ہلکا ہلکا بخار چڑھ رہا ہو یہ مٹھاس، یہ درد، یہ کسک اسی انفرادی غم کا خاصہ ہیں جہاں انسان کو فرد سماج سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات کے کُنویں ہی کو سمندر سمجھنے لگتا ہے۔

مگر تاباںؔ بہت عرصہ تک اس دھوکہ میں نہیں رہے۔ انھوں نے فرد کو سماج کے ساتھ جڑتے دیکھا تو سماجی شعور کا راستہ واضح نظر آیا معلوم ہوا جو سماج کا غم ہے وہی چھوٹے پیمانے پر فرد کا غم ہے اور جب تک سماج کا غم دور نہیں ہوتا فرد مسرت کے ساحل کو نہیں چھو سکتا پہلے دَور کی شاعری میں یہ احساس کمزور تھا۔

"دُور ایک شمع سرِ راہگزر ہے لرزاں"

آہستہ آہستہ یہ شمع قریب آتی گئی اور شاعر مسرت سے چلّا اُٹھا۔

"اُدھر تو دیکھ خزاں کا وہ دَور ختم ہوا
چمن چمن ہے بہاروں کا سُرخ نظارا"

"سوادِ مرگ میں آخر حیات ڈھونڈ ہی لی
گُناہگاروں نے راہِ نجات ڈھونڈ ہی لی"

تاباںؔ کے ذہن سے تاریک روایاتی جالے دور ہوئے اور اُس کے ذہن و عمل

میں اک تختگی۔ تازگی اور درخشندگی آتی گئی۔

"قید اوہام سے آزاد ہوئے فکر و نظر
جل اُٹھے تیرہ و تاریک دماغوں میں چراغ
آخرش چاند ستاروں میں بھٹکنے والے
پا گئے خاک کے ذرّوں ہی میں منزل کا سُراغ"

ظاہر ہے کہ اس منزل کا سُراغ پانے کیلئے تاباںؔ کو کتنی کاوش کرنی پڑی کتنی بار اُس کا دل امید و بیم کے ہنڈولے میں ڈولا کتنی بار وہ دورلہے پر کھڑا ہوا۔

"ٹوٹتے تاروں سے کھیلوں یا سحر کو ساز دوں
عشرتِ بزمِ شبستاں —— تلخیِ کارِ جہاں
موت کو آواز دوں یا زیست کو آواز دوں"

"میرا احساس ابھی تک ہے تذبذب کا شکار
آہ ملتی ہی نہیں کشمکشِ غم سے نجات"

کئی بار اس کے دل میں شک کے طوفان اُٹھے۔

"میں نے دیکھا ہے جو فردا کا چمکتا ہوا خواب
کیا وہ بیگانۂ تعبیر رہے گا اے دوست"

یہ پیچ کی منزلیں بڑی کٹھن پُرپیچ اور دشوار ہوتی ہیں لیکن تاباںؔ نے اپنی

شاعری میں ان سے گریز نہیں کیا انھیں چھپایا نہیں بلکہ صاف طور پر واضح طور پر اور بڑی
دیانت داری سے ان منزلوں پر روشنی ڈالی جن پر سے گذرتا ہوا وہ آج اپنے دوسرے
ساتھیوں سے آن ملا ہے۔ یہاں آ کر اُس کی شاعری میں ایک نئی قوت ایک نئی دھمک
ایک نئے رچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں شاعر اپنے ماضی کو دیکھتا ہوا، اپنے حال پر غور
کرتا ہوا مستقبل کیلئے اور اُسکے حصول کیلئے کوشش کرتا ہے اُس سے اسکی شاعری میں ایک نئی
گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور محبت ایک انسان اور ایک شئے جامد کا رشتہ نہیں ایک انسان اور
انسان کے درمیان تکمیل حسن کا جذبہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک پہاڑی گیت کی گونج جو اس سے پہلے
شاعر کے دل میں صرف رسمی عشق کا جذبہ بیدار کرتی آج اُسے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ سوچتا ہے
کہ یہ گیت کیا ہے۔ اپنے اسلاف کی عظمت کہ زمانے کا گلہ

شومیٔ بخت کہ ابنائے وطن کا شکوہ

ڈیڑھ سو سال کی مجہول سیاست کے نقوش

کس طرح اجنبی ہاتھوں نے کیا ہے تاراج

یہ چمن زار یہ پُر کیف بہاروں کا وطن

یا کوئی منظرِ رنگیں۔

رات کو سوتے وقت پڑوس کے گھر سے کسی عورت کے گنگنانے کی آواز سنتا ہے
لیکن اب اُس کے جذبات شعلے کی طرح بھڑک نہیں جاتے بلکہ مترتب انداز میں اپنے

آپ کو ٹٹولتے ہیں۔ شاعر کی فکر رسا اک گہری سوچ میں ڈوب کے اشاریت اور رمزیت کے مزے لیتی ہوئی اس حسین آواز کی پرتیں کھولتی سماجی حقیقت کو آشکار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ "پڑوسن" میرے خیال میں تاباں کی بڑی خوبصورت اور کامیاب نظم ہے۔

"صرف آواز سنی ہے اُس کی

شب کی تنہائی میں کیا گاتی ہے؟ — کیوں گاتی ہے؟ — کون کہے؟

....

کتنا غمگین ہے لہجہ اُس کا؟

درد میں ڈوبا ہوا

ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے

— دشت بے آب وگیاہ

اور سڑتی ہوئی گلتی ہوئی لاشیں ہر سمت"

تخئیل نے اپنے ہونٹ حقیقت سے ملا دیئے اور یہ نظم ایک خوبصورت بوسہ بن گئی جس کے ذائقہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی رمزیت کی بڑی ہی خوبصورت مثال ہے یہ نظم۔

تاباں نے اپنے بیشتر شعری کارناموں کو تاریخی مادیت میں سمو کے پیش کیا ہے جس سے زندگی کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

"کبھی پیرس کا کمیون

کبھی روسی مزدور

زار کا تختہ اُلٹنے کیلئے تیغ بکف

مختلف باب مگر ایک پلاٹ

وہی طبقات کی جنگ"

اب وہ یوں نہیں کہتا

"ڈوبتی جاتی ہے نبضِ احساس"

اب اُسے انساں کی عظمت کا یقین ہے۔ اور وہ بڑے پُر اُمید رجائی لہجے میں کہتا ہے۔

"اِک نہ اِک روز اُلٹ جائیگی فطرت کی نقاب

اہلِ محفل پہ عیاں رازِ دروں کر دیں گے"

تاباں کی سیاسی نظموں میں مجھے "دیوالی" بہت پسند ہے مختلف مذہبی تہواروں کو جس طرح امیر طبقہ اپنے اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے اُس کی اشاراتی کیفیت اُس کے آخری بند میں ملتی ہے۔

"سیاہیوں کے نمائندے۔ رات کے بیٹے

ہمارے فکر و تخیل کو باندھنے کے لئے

توہمات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی کبھی شب برات آتی ہے"

اُسے دیوالی اور شب برات سے نفرت نہیں۔ اُسے نفرت ہے اُن سے۔ جو دیوالی اور شب برات کو اپنے رجعتی مفاد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ جنھوں نے تقسیم ہند کے موقع پر اپنے مفاد کی خاطر وحشت اور بربریت کا بازار گرم کیا۔ جس کی ایک تلخ مگر سچی تصویر "انتقام" میں ملتی ہے، اُس نے ۱۵ اگست کے اُجالے میں چھپے ہوئے تاریک نہاں خانے کو دیکھ لیا ہے۔ جہاں پُرانے افلاس کی پھٹی چادریں اوڑھے ہندوستان کے عوام بدستور اپنے معاشی نظام میں مقید ہیں۔ یہی وہ تلخ احساسِ زیست تھا جو شاعر کو سچ کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور جس کی شدّت اور کربنا کی اُسے کھینچ کر جیل میں بھی لے گئی لیکن جیل جاکر بھی تاباں کا من میلا نہیں ہوا وہ اب بھی محبّت کرتا ہے اور جیل میں کسی کا خط پاکر کہتا ہے۔

"اے دوست غم کے گہرے اندھیرے میں آج بھی
اک اخترِ وفا کو مرا انتظار ہے"

لیکن اب اُس کو معلوم ہو چکا ہے۔

"جو میرے انتظار میں ہیں اُن کو کیا خبر — تہذیب وارتقا کو مرا انتظار ہے
اٹھتی ہیں بار بار نگاہیں مری طرف — جمہور ایشیا کو مرا انتظار ہے"

اب شاعر کو اس کا مقام اس کا فرض اور اسکا احساس قومی اُس کی انا سے باہر ایشیا کے میدانوں میں لے جاتا ہے جہاں محبّ الوطن ایک بہتر ایشیا کے لئے لڑ رہے ہیں۔ حالات مخالف ہیں، سامراجی یلغار پر یلغار کئے جا رہے ہیں لیکن تاباںؔ کو اپنی فتح پر یقین ہے اور وہ پُر شکوہ شاہینی لہجہ میں ہم سے مخاطب ہو کے کہتا ہے۔

"باغِ عالم پہ ہوئے کتنے خزاں کے یلغار
زندگانی پہ کئی موت نے چھاپے مارے
کبھی یوناں سے کبھی روم سے طوفاں اُٹھے
وادیٔ نیل سے اُبلا کبھی خونی سیلاب
آگ بھڑکی کبھی آتش کدۂ فارس سے
زندگی شعلوں میں تپ تپ کے نکھرتی ہی گئی
جتنی تاراج ہوئی اور سنورتی ہی گئی"

زندگی کا یہ قوی اور جری احساس ساز لرزاں نہیں ایک مضبوط آہنگ کا پتہ دیتا ہے۔ اُردو کی ترقی پسند شاعری نے تاباںؔ سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

کرشن چندر

ساتھ اُن کے

ساتھ اُن کے رونقِ بزمِ شبستانی گئی
چاند کی تابش، ستاروں کی درخشانی گئی
وہ شفق کی کوثر و تسنیم بر دوشی کہاں
وہ اُفق کی صبح دم فردوس سامانی گئی
اب کہاں باقی رہا اگلا سا ذوقِ شاعری
طبعِ حاضر کی وہ موزونی وہ جولانی گئی
ہم نشیں گنگا کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر
چاندنی راتوں کی وہ بزمِ غزل خوانی گئی

زندگی کا ساز کچھ اس طرح برہم ہو گیا
وہ ترنم کوشیاں، وہ نغمہ سامانی گئی
ایک ساقی ہی کے دم سے تھی بہارِ میکدہ
ساغر و مینا کی تاباں وہ گل افشانی گئی

۷

جب سکوتِ شام میں اک نغمگی سی پاؤ گی
تم بھی اپنی زندگی میں کچھ کمی سی پاؤ گی
"پی کہاں" پیدا کرے گی جب فضا میں ارتعاش
زندگی کے ساز میں اک برہمی سی پاؤ گی
جھوم کر چھا جائے گی ساون کی جب کالی گھٹا
ان حسیں آنکھوں میں اک نازک نمی سی پاؤ گی
بے سبب پژمردہ و افسردہ رہو گی رات دن
بے سبب دلچسپیوں میں تم کمی سی پاؤ گی

ایک لذت سی ملے گی داستانِ ہجر میں
غم کے افسانوں میں طرفہ دلکشی سی پاؤگی

ہوک سی دل میں اُٹھے گی سن کے کوئل کی صدا
میٹھے نغموں میں بھی غم کی چاشنی سی پاؤگی

دیکھ کر رنگِ چمن دل کی کلی مُرجھائے گی
تم بہاروں میں بھی اک افسردگی سی پاؤگی

جب کبھی بھولے سے دل میں یاد آئیگی مری
گرم پیشانی میں تم کچھ کچھ نمی سی پاؤگی

جب کسی اخبار میں دیکھوگی تم میرا کلام
آنکھ میں آنسو مگر دل میں خوشی سی پاؤگی

سحر

سحر ہونے کو ہے خوابیدہ فطرت جاگ اُٹھے گی
جوانی جاگ اُٹھے گی محبّت جاگ اُٹھے گی

کسی مجبور کی آنکھوں میں آنسو جاگ جائینگے
کسی مایوس کے سینے میں حسرت جاگ اُٹھے گی

کسی خوش ذوق بادہ کش کی رِندی جاگ جائے گی
کسی خوش فکر شاعر کی طبیعت جاگ اُٹھے گی

اُفق کی گود میں انگڑائیاں لے گی سحر تابی
نمودِ حسن رنگ و بُو کی صورت جاگ اُٹھے گی

چمن بیدار ہو جائے گا بُلبُل کے ترانوں سے
ہَوا کی چھیڑ سے پھولوں کی نکہت جاگ اُٹھے گی

فضا سے سرد ظلمت دُور ہو جائے گی اے ہمدم
ضیائیں جاگ اُٹھیں گی حرارت جاگ اُٹھے گی

حقیقت جاگ اُٹھے گی مجازانہ مجازانہ
مجازانہ مجازانہ حقیقت جاگ اُٹھے گی

سحر کی خوبیاں برحق مگر تاہاں یہ ڈرتا ہوں
کہ کچّی نیند سے وہ ماہ طلعت جاگ اُٹھے گی

انتظارِ سحر

تنویرِ صبحِ صادق بیدار ہو چکی تھی
خوابیدگی سے فطرت ہشیار ہو چلی تھی

پچھلے پہر کا تارا مستور ہو چکا تھا
بڑھتا ہوا اجالا بھرپور ہو چکا تھا

کہرے کی چلمنوں سے سرخی جھلک رہی تھی
جامِ افق سے جیسے صہبا چھلک رہی تھی

چاندی برس رہی تھی سونا پگھل رہا تھا
مشرق کی وادیوں سے سورج نکل رہا تھا

خورشید کا تبسم جادو جگا رہا تھا
اک رنگ آرہا تھا اک رنگ جا رہا تھا

پہلی کرن خوشی کا پیغام دے رہی تھی
روحِ طرب فضا میں انگڑائی لے رہی تھی

ٹھنڈی ہوائیں جیسے نغمے مچل رہے تھے
بربط نواز جھونکے رک رک کے چل رہے تھے

شاخیں لچک رہی تھیں سبزہ لہک رہا تھا
کلیاں چٹک رہی تھیں صحرا مہک رہا تھا

گنگا کے آئینہ میں کرنیں جھمک رہی تھیں
پانی چمک رہا تھا موجیں دمک رہی تھیں

آبِ رواں میں جیسے شعلے مچل رہے تھے
سینوں میں بلبلوں کے دیپک سے جل رہے تھے

موجیں اُبھر اُبھر کے کرنوں کو چومتی تھیں
مستانہ وار فرطِ اُلفت سے جھومتی تھیں

یعنی سحر پیامِ عیش و نشاط لائی
شاعر کی آنکھ لیکن کچھ سوچ کر بھر آئی

اسکی نظر میں ذہنِ انساں کی ظلمتیں تھیں
اُسکی نظر میں باطل عرفاں کی ظلمتیں تھیں

اُسکی نظر میں بختِ سائل کی تیرگی تھی
اُسکی نظر میں منعم کے دل کی تیرگی تھی

چھایا ہوا تھا ہر سو اوہام کا اندھیرا
اِدبار کی سیاہی آلام کا اندھیرا

شاعر اُفق کی جانب رہ رہ کے دیکھتا تھا
اک اور ہی سحر کی وہ راہ تک رہا تھا

طاقتِ رفتارِ تاباں آزمانا ہے مجھے
مشکلاتِ راہ کو آساں بنانا ہے مجھے
کچھ بھی ہو لیکن قدم آگے بڑھانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

گرمیِ رفتارِ عہدِ نوجوانی کی قسم
برق گامی کی قسم طوفاں خرامی کی قسم
امتیازِ دُوری و قربت مٹانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

بڑھ چکا ہی جو قدم پیچھے وہ ہٹ سکتا نہیں
چاہے کچھ ہو جائے لیکن میں پلٹ سکتا نہیں
اب تو بڑھنا ہی مجھے بڑھتے ہی جانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

ڈگمگاتا۔ لڑکھڑاتا۔ ٹھوکریں کھاتا ہوا
میں چلا جاؤں گا قرب و بُعد پر چھاتا ہوا
ذرّۂ ثابت کو سیّارہ بنانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

راستہ میں خشمگیں طوفان حائل ہی سہی
ایک اِک ذرّہ جفا کوشی پہ مائل ہی سہی
ہم نشیں پھر بھی قدم آگے بڑھانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

خار کیا تلوار سدِّ راہ بن سکتی نہیں
آہنی دیوار سدِ راہ بن سکتی نہیں
انقلابی عزمِ مستحکم دکھانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

راہ کی دُشواریوں سے کھیلتا جاؤنگا میں
سخت ناہمواریوں سے کھیلتا جاؤنگا میں
آبلہ پائی پہ تاباںؔ مسکرانا ہے مجھے

دُور جانا ہے مجھے

یاد ہے تم کو بھی وہ ننھّا سا پھُول

(۱)

نرم و نازک، خوبصورت، بادہ فام
رنگ و بُو کا پیکرِ رعنا تمام
وہ پیامِ حُسن، وہ حُسنِ پیام
جو مجھے بھیجا گیا تھا ایک شام

(۲)

ماہ وش شعلہ جبیں رنگیں قبا

کیف پرور، دلنواز و جاں فزا
غنچگی کا پیشکر رنگیں ادا
نکہتوں کی گود کا پالا ہوا

(۳)

عطر ریز و عطر بیز و عطر بار
صانعِ قدرت کا تازہ شاہکار
خود نگارِ حسن، خود حسنِ نگار
فطرتِ صد رنگ کا آئینہ دار

(۴)

جنّتِ احساس، فردوسِ نظر
حسن و خوبی کا مرقّع سر بسر
نزہتِ جذبات کا پیغام بر
دعوتِ جرأت بہ عنوانِ دگر

(۵)

حسن کا پیغمبرِ آتش زباں
ربطِ باہم کی مجسّم داستاں

ظاہری بیگانگی کا رازداں
باطنی کیفیّتوں کا ترجماں

(۶)

قاصدِ رنگیں قبائے التفات
مژدۂ عشرت فزائے التفات

حاملِ پیغام ہائے التفات
مظہرِ صد ادعائے التفات

طالب سے

ترا ارشاد میرے واسطے قانون ہے طالب
مگر مجبور ہوں میں اپنے ذوقِ امتیازی سے
جو چاہوں طرح پر بھی شعر کہہ سکتا ہوں میں لیکن
مجھے نفرت سی ہے کچھ صنعتِ اشعار سازی سے
مرے نغموں میں گر سوزِ نیستانی نہ ہو شامل
فضا کو خاک گرماؤں گا حسنِ نَے نوازی سے
میں گاتا ہوں مگر جب روح میں ہیجان ہوتا ہے
ستارے گونج اُٹھتے ہیں مری نغمہ طرازی سے

مرے لب پر بھی رہتا ہے جنوں کا زمزمہ اکثر
مگر وہ مختلف ہوتا ہے شغلِ بیت بازی سے
کبھی مجبور ہو جاتا ہوں میں بھی شعر کہنے پر
مگر کیا واسطہ اُس کو طریقِ شعر سازی سے
مجھے اسلوبِ نَو کا غزنوی بنکر چمکنا ہے
مری فطرت گریزاں ہے قدامت کی ایازی سے
یہ میری عاف گوئی حدِ گستاخی میں آتی ہے
مگر ہوں عفو کا خواہاں تری تاباں نوازی سے

حسین انقلابی

وہ ہونٹوں پہ رقصاں شعاعِ شہابی
وہ چہرہ وفورِ حیا سے گلابی

وہ نینا رسیلے کہ مدھ کے پیالے
وہ نظروں کا عالم شرابی شرابی

وہ ماتھے پہ بندی فلک پہ ستارا
وہ عارض کہ آئینہ ماہتابی

وہ بالوں میں ساون کی راتوں کا عالم
وہ ساڑی کا آنچل گلابی گلابی

وہ موزوں سا قد وہ چھریرا سا جثّہ
وہ لانبی سی گردن وہ چہرہ کتابی

لطافت مجسّم نزاکت سراپا
بہاروں کا اک پیکرِ نوشبابی

شرافت سے معمور اسکی جسارت حجابوں میں ڈوبی ہوئی بے حجابی

وہ پستی میں بھی ایک شانِ بلندی وہ اعلیٰ تخیل کی گردوں رکابی

لبِ احمریں پر وہ آزاد نعرے وہ نازک سے ہاتھوں میں پرچم شہابی

رگوں میں رواں حریت کا لہو ہے نگاہوں میں ہے منزلِ کامیابی

تخیل میں احساسِ دوریٔ منزل قدم اٹھ رہے ہیں شتابی شتابی

ہر اِک گام پر لاکھ فتنے اُٹھاتی

چلی جا رہی ہے حسیں انقلابی

بھیگ چکا ہے رات کا دامن تارے جھلمل ہوتے ہیں
جاگ اُٹھی ہے صُبح کی دیوی دُنیا والے سوتے ہیں
پورب میں کچھ ہلکی ہلکی سنولاہٹ سی چھائی ہے
پہلی کرن نظروں سے نہاں مصروفِ خلد آرائی ہے
دُور یہاں سے دُور اُفق پر کچّی چاندی گلتی ہے
فِطرت کی دوشیزہ رُخ پر نور کا غازہ ملتی ہے
پھیل چکی ہے صُبح کی تابِش جلوہ گاہِ ہستی میں
جنگل میں کہساروں میں میدانوں میں اور بستی میں

گھاٹ پہ اک لڑکی گنگا سے جل بھرنے کو جاتی ہے
اُٹھتی جوانی رُوپ نرالا چلتی ہے اور گاتی ہے
گال دمکتے کندن جیسے آنکھوں سے مے ڈھلتی ہے
کافر گیسو دُوش پہ بکھرے مست ادا سے چلتی ہے
ہونٹوں پر بیتاب ترانے رقصِ پیہم کرتے ہیں
کیف و مستی کی دولت سے صُبح کا دامن بھرتے ہیں
کون ہے یہ سنگیت کی رانی کن آنکھوں کا تارا ہے؟
جس کے غم میں گاتی ہے وہ کون مقدّر والا ہے؟
جنگل سارا گونج رہا ہے میٹھی میٹھی تانوں سے
جھانک رہی ہے راگ کی دیوی آکاشی ایوانوں سے
رَس کی بھری آواز ہَوا کی لہروں میں لہراتی ہے
نغموں کا اِک جال فضا میں جیسے بُنتی جاتی ہے
زیر و بم گنگا کی لہروں سے جا کر ٹکراتے ہیں
ٹکرا کر جب اُٹھتے ہیں تو ہستی پر چھا جاتے ہیں
پنچم تانوں سے سینے میں دیپک جلتے جاتے ہیں
شعلوں کے سانچے میں جیسے نغمے ڈھلتے جاتے ہیں
گیت کے ہر ہر بول سے دل میں نشتر ٹوٹا جاتا ہے
ہاتھ سے میرے ہوش کا دامن تاباںؔ چھوٹا جاتا ہے

وہ

سحر کی مسکراہٹوں میں مسکرا رہی ہے وہ
ہوا کی گنگناہٹوں میں گنگنا رہی ہے وہ
جلو میں اپنے نور کی تجلیاں لئے ہوئے
طلسمِ شب کو توڑتی اُفق سے آ رہی ہے وہ
فضا میں رفتہ رفتہ بکھری جا رہی ہیں تابشیں
جبیں سے اپنی زلفِ عنبریں ہٹا رہی ہے وہ
برس رہی ہے تازگی اُبل رہی ہے غنچگی
بہار بن کے منظرِ نظر پہ چھا رہی ہے وہ

زمانہ گوش بر صدا ہے رُک گئی ہیں گردشیں
خموشیوں کے ساز پر غزل سُنا رہی ہے وہ

سمائی جا رہی ہے میرے دل میں میری روح میں
مرے نفس نفس کو جیسے جگمگا رہی ہے وہ

نہ اب خرد کا ہوش ہے نہ کچھ جنوں کا پاس ہے
بلند و پستِ زندگی پہ چھائے جا رہی ہے وہ

مجھے تو یاد ہے اب بھی وہ رات اے رانی

وہ رات ہم نے جو فردوس سے چرائی تھی
مہ و نجوم کی تنویر سے سجائی تھی
وہی حسین خنک گرمیوں کی رات کہ جب
تو پہلی بار مری زندگی میں آئی تھی

وہ خامشی کا ترنم، وہ چاندنی کا نکھار
وہ عطر بیز نسیمِ خنک، سبک رفتار

وہ بہکی بہکی فضاؤں میں کیفِ رومانی
وہ کائنات پہ چھایا ہوا لطیف خُمار

وہ چاندنی لبِ دریا سکوت تنہائی
فضا سے ڈھلتی ہوئی جنّتوں کی رعنائی
رتیلے فرش پہ وہ کہکشاں کی چھاؤں میں
نشاط و کیف و محبّت کی بزم آرائی

ترے جمال سے شاداب تھی مری دُنیا
نفس نفس میں تھی کیفیتِ مے و مینا
ترے لبوں کے اُس اِک لَمسِ جاودانی میں
سمٹ کے آگئے تھے حال و ماضی و فردا

حسین رات محبّت کی شادمانی کی
وہ ابتدا تھی مری دُکھ بھری کہانی کی

زندگانی کے بھڑکتے ہوئے میخانے سے
بادۂ تلخیٔ ایام ابھی پینا ہے
سازگاری نہیں کرتی ہے ہوائے اِمروز
پھر بھی اُمید پہ فردا کی ہمیں جینا ہے

نارسا بخت - زمانے کا بہیمانہ چلن
کتنی اُفتادیں ہیں دُنیا میں محبّت کیلئے
اور بے رُوح روایات کا فرسُودہ نظام
یہ بھی منجملۂ آفات ہے اُلفت کیلئے

درد کے بوجھ سے احساس دبا جاتا ہے
حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں تدبیریں شل
تیرہ و تار ہے دُنیائے تمنّا کی فضا
چھا رہے ہیں غم و آلام کے گہرے بادل

ٹمٹماتا ہوا اُمید کا ننھا سا چراغ
کسی مایوس کے سینے کا دہکتا ہوا داغ
اب بھی جلتا ہے مگر غم کے شبستانوں میں

اُف یہ پورب کی ہوا ہائے یہ کالے بادل
رس بھری بوندوں سے بھیگا ہوا شب کا آنچل
لا مرا جام کہاں ہے مری مے کی بوتل
آج پینے کا مزا ہے مجھے پی لینے دے
موت کی چھاؤں میں اک رات تو جی لینے دے

رات اپنی ہے مری جان سحر ہو کہ نہ ہو
پھر کوئی لمحۂ محبت کا بسر ہو کہ نہ ہو
اور ضو بارِ طرب شعلۂ تر ہو کہ نہ ہو
کل خدا جانے کہاں جستجو لے جائے گی
اجنبی وادیوں میں ٹھوکریں کھلوائے گی

میں مسافر ہوں بہت دُور ہے میری منزل
راہ میں سیکڑوں طوفانِ حوادث حائل
میں کہاں اور کہاں پھر یہ نشاطِ محفل
صُبح ہوتے ہی اُکھڑ جائے گا ڈیرا اپنا
جانے کل رات کہاں ہوگا بسیرا اپنا

غم کا مارا ہوا آلام کا تڑپایا ہوا
ناسزا صورتِ حالات کا سہمایا ہوا
اور اس کشمکشِ زیست سے اُکتایا ہوا
توڑ کر بندِ قفس آج یہاں آیا ہوں
اپنے پہلو میں دَہکتا ہوا دل لایا ہوں

بزم میں دُھوم مچانے کیلئے آیا ہوں
تلخیٔ غم کو بھلانے کیلئے آیا ہوں
آج میں پینے پلانے کیلئے آیا ہوں
تو بھی پی لے مری جاں مُجھکو بھی پی لینے دے
موت کی چھاؤں میں اک رات تو جی لینے دے

میں نے اک بار بس اک بار محبت کی ہے

ایک نوخیز حسیں پیکرِ تنویر کے ساتھ
تھی جو وابستہ ازل سے مری تقدیر کے ساتھ

نغمہ و نور سے معمور تھی ہستی کی فضا

زندگی ایک چھلکتا ہوا جامِ رنگیں
ہر نفس عیش و مسرت کا پیامِ رنگیں

شمع بن کر وہ رہی میرے شبستانوں میں

ماہِ کامل کی فسوں ساز ضیاؤں کی طرح
خاورِ صبح کی زرکار شعاؤں کی طرح

زندگی خوابِ زلیخا کی حسیں تر تمثیل

حُسن اور عشق کا رُومان بھرا افسانہ
بادۂ عیش سے لبریز مِرا پیمانہ

اور اس خوابِ مُحبّت کی بھیانک تعبیر
ایک ٹوٹا ہوا دِل سُوز کا پگھلایا ہوا
غم کا مارا ہوا آلام کا تڑپایا ہوا

یاد

آج پھر فکر و نظر خوابوں کی جولاں گاہ ہے
زندگی بھٹکی ہوئی ہے آرزو گمراہ ہے

آج پھر یاد آرہا ہے وہ شبستانِ جمال
نیم خوابیدہ شبستاں نور و نکہت کا سراب
عطر برساتی ہوائیں چودھویں کا ماہتاب

آسماں پر دُور تک پھیلا ہوا تاروں کا جال
اور تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ میرے قریب
رفعتِ عرشِ بریں پر خندہ زن میرا نصیب

ہر نفس موجِ مسرت ہر نظر عکسِ جمال

اور اُن رنگیں لبوں کا ایک لمسِ آتشیں

آج تک جو میرے ہونٹوں پر ہے لذت آفریں

ہوگیا تھا جس سے دو رُوحوں کا باہم اتصال

بے کراں لمحے مقام و وقت کی راہوں سے دُور

زندگی اور موت کی ان کشمکش گاہوں سے دُور

آج وہ دمساز لمحے ہوگئے خواب و خیال

آج پھر فکر و نظر خوابوں کی جولاں گاہ ہے

زندگی بھٹکی ہوئی ہے آرزو گُمراہ ہے

آج پھر یاد آرہا ہے وہ شبستانِ جمال

امیدِ موہوم

اب بھی اُمید ہے موہوم سہی خام سہی
یہ بھی اک شعبدۂ حسرتِ ناکام سہی
یا مرے مشقِ تصوّر ہی کا انجام سہی
خود فریبی سہی دھوکا سہی اوہام سہی

پھر بھی اُمید ہے اُمید پہ جیتا ہوں میں

ان چمکتے ہوئے خوابوں ہی سے دامن بھر لوں
سعیِ بے سود سہی اُس کی تمنا کر لوں

زندگانی کیلئے کچھ تو سہارا مل جائے

لٹ رہے ہیں مرے اشکوں کے گہر یونہی سہی

میری آہوں میں نہیں جذب و اثر یونہی سہی

مضمحل ہے جو مرا ذوقِ نظر یونہی سہی

بر سرِ جنگ ہے تقدیر اگر یونہی سہی

فکر کیا درد کا زہراب جو پیتا ہوں میں

اے غمِ دل مری حالت پہ مجھے رہنے دے

بحرِ ذخّارِ محبّت میں یونہی بہنے دے

کون جانے مری کشتی کو کنارا مل جائے

اثرِ ماہ

چشمۂ شبنم میں جیسے ڈھل رہی ہے چاندنی
رفتہ رفتہ تیرگی میں گھل رہی ہے چاندنی
پھیلتا جاتا ہے دُنیا پر حسیں خوابوں کا جال
جس طرح شاعر کے پُراَسرار آوارہ خیال
ایک بے پایاں فسوں طاری ہے زیرِ آسماں
لے رہا ہے درد کا مارا شباب انگڑائیاں
کیف و مستی کا وفورِ بیکراں اعصاب میں
بہہ رہی ہے زندگی جذبات کے سیلاب میں

یہ درخشاں چاندنی راتیں یہ لمحاتِ جنوں
کس کے ماتھے جائیگا یارب تمنّاؤں کا خوں

نومیدی

میری نوخیز اُمیدوں کا طِلسم رنگیں
رات کی رات تھا ہنگام سحر ٹوٹ گیا
سپیدۂ صبح کی پہلی ہی کرن کے ہمراہ
شب کا افسوں مرا پندارِ نظر ٹوٹ گیا
ہو گیا بند دُعاؤں پہ بھی تاثیر کا باب
رشتۂ آہِ فلک سیر و اثر ٹوٹ گیا
کسی مایوس کی دولت یہی اک قطرۂ اشک
اور مژگاں سے وہ نایاب گہر ٹوٹ گیا

شام سے سینے میں جو شمع جلا رکھی تھی
بجھ گئی بادِ مخالف کے تھپیڑے کھا کر
رات بھر میں نے جو تعمیر کیا تھا اے دوست
ہو گیا ڈھیر وہ رنگین خیالات کا گھر
میں نے جو بزم سجائی تھی تصوّر میں ترے
لوٹ لی یاس کے رہزن نے بہ ہنگامِ سحر
میں نے جو گیت سُنانے کو تجھے لکھا تھا
اب بھی اُس گیت کا لاشہ ہے مرے ہونٹوں پر

اب وہ کیفِ فراواں نہ وہ ذوقِ سرشار
ایک حسرت ہے مگر خاک بسر ہی وہ بھی
میرا سینہ ہے غم و سوزش و آلام کا گھر
دل کو کیا کہئے کہ قندیلِ سحر ہی وہ بھی
غم کا یہ بارِ گراں مایہ اُٹھاؤں کیوں کر
لُطف کی آس! تو ممنوع شجر ہی وہ بھی
میری نظروں میں ہے تاریک ضیائے خورشید
منظرِ لالۂ و گُل حسنِ نظر ہی وہ بھی

لمحۂ فکریہ

رات کے گیسو ڈھلک کر آ گئے ہیں تا کمر
آسماں پر کھلتا ہے سمن زارِ نجوم
چھا رہی ہیں بام و در پہ مضمحل خاموشیاں
میں ہوں اور افسردہ آوارہ خیالوں کا ہجوم

دیر سے کھویا ہوا بیٹھا ہوں گہری سوچ میں
زندگی کے مختلف شعبوں پہ ہے میری نظر
آدمیت، بربریت، خلق، جنگِ زرگری
مظہرِ شیطان و یزداں، امتزاجِ خیر و شر

اِک طرف سرمایہ داری اِک طرف فاقہ کشی
اِک طرف صہبائے رنگیں اِک طرف خونِ شباب
کوئی حد بھی ہے یہ تفریقِ مراتب تابہ کے
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

بڑھ چکی حد سے زمانہ کی قدامت پروری
اب بدل دیں زندگی کا یہ کہن سالہ نظام
عام ہو جائے نہ کیوں میخانۂ ہستی کا فیض
کیوں کوئی میکش رہے بزمِ جہاں میں تشنہ کام

ظلمتوں میں گھر گیا ہے زندگی کا قافلہ
اِس سیہ خانہ میں شمعِ فکرِ نو روشن کریں
چل رہی ہیں آج جنگِ زرگری کی آندھیاں
ہم چراغِ آدمیت کو تہِ دامن کریں

اب اُبھرتے ہی کو ہے تہذیبِ نو کا آفتاب
یہ فضائے تیرہ ہے تمہیدِ صبحِ انقلاب

پس منظر

وہی دُنیا وہی دستُور دُنیا
وہی فرسُودہ قدروں کی سیاست
وہی گُل چیں وہی دانہ وہی دام
وہی زندانِ غمِ آدمیت
وہی مجبوریوں کا اک فسانہ
وہی پابندیوں کی اک حکایت
وہی سنگیں جمُودِ زندگانی
وہی انساں وہی قیدِ مشیت

وہی افلاسِ ذہنی کے مظاہر
وہی ہر بات میں رنگِ قدامت
وہی احساس پر نشہ سا طاری
وہی ادراک پر چھائی سی غفلت
وہی اخلاق کے بے رُوح قانون
وہی تہذیب کی مُردہ شریعت
وہی ماحول کی بھاری سلاسل
وہی جانکاہ احساسِ ہزیمت
وہی بھڑکے ہوئے شعلے ہوس کے
وہی شعلوں کی زد پہ آدمیت
وہی پیشِ نظر خونی مناظر
وہی ہنگامہ زارِ قتل و غارت

پسِ منظر یہ تاباں زندگی کا
اور اُس پہ خواہشِ عیش و مسرت

میرے محبوب نہ کر سعیِ مداوائے الم
میرے اشکوں کی گھٹاؤں کو برسنے دے ابھی
اور ہاں اور تمنّا کا لہو بہنے دے
اور ہاں اور جوانی کو ترسنے دے ابھی

یہ جواں رات یہ تارے یہ درخشاں مہتاب
یہ ترا حسن یہ رعنائی یہ نوخیز شباب
محفلِ جام و سبو، انجمنِ چنگ و رباب

تیری سوگند مرے درد کا درماں ہی نہیں

تیری آغوش ہے جذبات کی فردوس مگر
آہ ملتی ہی نہیں کشمکشِ غم سے نجات
آج تک تشنۂ تکمیل رہا میرا جنوں
وہی زنجیرِ مشیت وہی زندانِ حیات

میرا احساس ابھی تک ہے تذبذب کا شکار
ایک بے ربط سے ماحول کا آئینہ دار
ٹوٹ جائے نہ کہیں فکر و نظر کا پندار

آہ ملتی ہی نہیں کشمکشِ غم سے نجات

میرے محبوب کر سعیِ مداوائے الم
ابھی کچھ اور تمناؤں کا خوں کر لوں میں
اتنی مہلت تو دے تکمیلِ جنوں کر لوں میں

فرار

ہر ایک سمت یہ سنگیں بلند دیواریں
غمِ حیات نے محصور کر لیا اے دوست
اذیتوں سے دبا جا رہا ہے ذوقِ طلب
گناہِ زیست کی ملتی ہے یہ سزا اے دوست

یہاں سے بھاگ کے جائیں بھی تو کدھر جائیں
یہی زمین یہی آسماں جدھر جائیں

فلک سے چاند ستاروں سے کیا غرض ہم کو
شفق سے اُس کی بہاروں سے کیا غرض ہم کو
خلا میں محفلِ ہستی سجا کے کیا حاصل
توہمات کی بستی بسا کے کیا حاصل

تخیّلات کی جنّت سے ہم کو کیا لینا
ہوائی بزمِ مسرّت سے ہم کو کیا لینا

یہاں سے بھاگ کے جائیں بھی تو کدھر جائیں
یہی زمین یہی آسماں جِدھر جائیں
یمِ حیات میں اپنا یہی سفینہ ہے
اسی جگہ ہمیں مرنا یہیں پہ جینا ہے
خزاں کی چھاؤں میں جشنِ بہار کیوں نہ کریں
لہو سے اپنے زمیں لالہ زار کیوں نہ کریں

ہماری راہ میں یہ فکر گریز پا کیوں ہو
یہاں سے بھاگ نکلنے کا آسرا کیوں ہو

دو رُخ

پی چکا ہوں مئے عشرت کے چھلکتے ساغر

میں نے سمجھا تھا بہاروں سی بنی ہے دُنیا

پھول ہی پھول ہیں ہستی کے گلستانوں میں

دن بسر ہوتے تھے تفریح میں احباب کے ساتھ

راتیں کٹتی تھیں حسینوں کے شبستانوں میں

عیش و عشرت کیلئے وقف تھا ہر لمحہ

رقص گاہوں میں تماشوں میں خمستانوں میں

اور تلخابِ اذیّت بھی پیا ہے میں نے

میں نے پھولوں ہی کو سمجھا تھا چمن کا حاصل
ہائے کانٹوں نے بہاروں کا فسوں توڑ دیا
میرے بھٹکے ہوئے ماحولِ غمیں نے اے دوست
لے کے ہاتھوں سے مرے سازِ جنوں توڑ دیا
اور سوئے ہوئے احساس کی بیداری نے
رامش و رنگ کا پندارِ زبوں توڑ دیا

تیرا مہکا ہوا دہکا ہوا نوخیز شباب
خرمنِ ہوش میں اک آگ لگا دے اے کاش
تیرے انفاس کی گرمی ترے ہونٹوں کی تپش
میرے احساس کی دُنیا ہی جلا دے اے کاش

مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے بشر کی پستی
میری آنکھیں نہ رہیں یا یہ نظارے نہ رہیں
یا بدل جائے یہ فرسودہ نظامِ عالم
یا یہ دُنیا نہ رہے چاند ستارے نہ رہیں

آگ اور خون کے اُمڈے ہوئے طوفانوں میں
میرے اشعار مرا ساز بھلا کون سُنے
شورِ یلغار میں تلوار کی جھنکاروں میں
میرے ہمدم میری آواز بھلا کون سُنے

کب تلک سایۂ ادبار رہے گا سر پر
کب تلک آدمی یہ ظلم سہے گا اے دوست
میں نے دیکھا ہے جو فردا کا چمکتا ہوا خواب
کیا وہ بیگانۂ تعبیر رہے گا اے دوست

فتحپور سیکری

اکبر آباد کے اطراف میں آثارِ قدیم
آج بھی ملتے ہیں اسلاف کی عظمت کے نشاں
جودھا بائی کا محل مغلوں کی قومی تحریک
اس سے حاصل یہ کہانی نہ یہاں ہے نہ وہاں
ان ہی کھنڈروں میں تو رہتا تھا "خدا کا سایہ"
سُرخ پتھر سے جھلکتا ہے غریبوں کا لہو
دعوتِ مرگ تھا تیموری سیاست کا تضاد
اِک طرف خونِ جگر ایک طرف جام و سُبو

چند بوسیدہ محل چند زمیں بوس ستون
تاجداری کے ابھی نقش یہاں باقی ہیں
کسی سیّاح کی تفریح و تفنّن کیلئے
عہد پارینہ کے دُھندلے سے نشاں باقی ہیں
قیصریت کے یہ ژولیدہ و فرسودہ نقوش
ایک دن گردشِ ایّام مٹا ڈالے گی
انہی محلوں انہی ایوانوں کی بُنیادوں پر
قصرِ آزادیِ انساں کی بنا ڈالے گی
جل بُجھا قیصر و فغفور کی عظمت کا چراغ
محفلِ عظمتِ جمہور کا منظر دیکھیں
ہو چکا ختم جہانبانیِ چنگیز کا دور
اب جہانبانیٔ مزدور کا منظر دیکھیں

موت اور زندگی

یہ مئے تلخ بھی پینا ہی پڑے گی اک دن

موت برحق سہی پر زیست کا حاصل تو نہیں
کاروانِ طلب و شوق کی منزل تو نہیں
کتنی اُلجھی ہوئی راہوں سے گذرنا ہے ابھی
زندگانی کی مہم سر ہمیں کرنا ہے ابھی
زندگی موت سے تاریک بھیانک ہے ٹرمول
اک گراں بار تعطل کا فسردہ ماحول
اس سیہ خانہ میں اک شمع جلالیں اے دوست
بزم آزادیٔ جمہور سجالیں اے دوست

خونِ مہتاب سے تعمیرِ سحر کرنا ہے
قصرِ ظلمت کو ابھی زیر و زبر کرنا ہے
عالمِ تازہ کی تشکیل کا ساماں کریں
جب تلک زندہ ہیں کیوں موت کا ارماں کریں

موت تو آئے گی آ کر ہی رہے گی اِک دن

حیاتِ جاوید

ایک دن تاریخ کی ظلمت میں کھو جاؤں گا میں

زندگی کی راہ میں پامال ہو جاؤں گا میں

یہ شفق آلود شامیں نرم و نازک سی فضا

ڈھل گئی رعنائیِ فطرت مرے اشعار میں

گا چکا ہوں کتنے رنگیں گیت سازِ عشق پر

پڑھ چکا کتنے قصیدے حُسن کی سرکار میں

اہلِ گلشن سے کہا افسانۂ برق و شرار

قصۂ مُفلس سُنایا محفلِ زردار میں

دی بشارت صبح کی ظلمت زدہ انسان کو
قلبِ عصرِ نَو کی دھڑکن ہے مرے افکار میں
محرمِ اسرارِ فطرت ہے مری فکرِ رسا
بارہا پہونچا سوادِ ثابت و سیّار میں

میرے مرنے سے مرے اشعار مر سکتے نہیں
میری تصنیفیں مرے افکار مر سکتے نہیں

آج

گردشِ جام بھی ہے گردشِ ایّام بھی ہے
تابشِ صُبح میں افسردگیِ شام بھی ہے
زندگی ذوقِ طلب بھی، ہوسِ خام بھی ہے

وہی بے رنگ چمن اور خزاں بستہ بہار
نغمۂ چنگ میں گھُلتی ہوئی سنگیں جھنکار
خندۂ عیش کی چھاؤں میں وہ اشکوں کی قطار

عیش گاہوں میں کھنکتے ہوئے جام و مینا
کارخانوں سے دُھواں اُٹھتا ہوا گھُٹتا ہوا
جانے فردوس بریں ہے کہ جہنّم دُنیا

عام ہے محبس و زنجیر کا دستور ابھی
اپنے ماحول سے انسان ہے مجبور ابھی
صبحِ صادق ہے اسیرِ شبِ دیجور ابھی

اُف یہ ظلمت زدہ راہیں یہ اُمنڈتے طوفاں
دُور اک شمع سرِ راہ گزر ہے لرزاں
رہبر و راہ نما قربتِ منزل کا نشاں

روایاتی شاعر سے.....

زندگی خواب نہیں بادۂ سرجوش نہیں

رفعتِ بام فلک صرف نگاہوں کا فریب
کہکشاں جادۂ افکار گذرگاہِ خیال
ذوق پرواز المناک حقائق سے گریز
یہ تصوّف کے مسائل یہ سُریلے قوّال
راہ میں کوہ بھی تھے باغ بھی تھے راغ بھی تھے
تو بھٹکتا ہی رہا نجد کے صحراؤں میں

تیرا موضوعِ سخن ابرو و رخسارِ حبیب
زندگی کاٹ دی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں

پھر وہ فولاد کی جھنکار فضا میں گونجی
تیرے ہونٹوں پہ ہے الفت کا ترانہ ابتک

پھول جلتے ہیں گلستاں سے دھواں اٹھتا ہے
تو نہ بھولا گل و بلبل کا فسانہ ابتک

زیست اک تلخ حقیقت ہے، تجھے کیا معلوم
یہی دوزخ یہی جنت ہے، تجھے کیا معلوم

تلخیاں

اب بھی غم خانوں میں جلتے ہیں وفاؤں کے کنول
فطرتِ حسن جفا پیشہ و سفّاک سہی
زندگی لالہ و گل ہی تو نہیں خار بھی ہے
لبِ خنداں نہ سہی دیدۂ نمناک سہی

بزم میں جامِ مئے ناب نہ آیا مجھ تک
تشنگی بڑھتی گئی بڑھتی گئی بڑھتی گئی
میں نے کی ساحلِ عشرت کی تمنّا جتنی
اور بھی غم کی ندی چڑھتی گئی چڑھتی گئی

میں نے جو گیت بھی چھیڑا وہ فغاں بن کے رہا
پردۂ ساز سے فولاد کی جھنکار اُٹھی
اور جو پھول چُنا خار بداماں نکلا
ہر طرف باغ میں میرے لئے تلوار اُٹھی

میں نے جو راہ نکالی وہی مسدود ہوئی
کارواں بڑھتے رہے منزلیں طے ہوتی رہیں
میں تو اُلجھا رہا سنگینوں میں زنجیروں میں
رقص کرتی رہی بے پایاں خلاؤں میں زمیں

یہ عفونت زدہ تاریکیاں۔ عفریت کا گھر
زیر افلاک کوئی اختر لرزاں بھی نہیں
جانے یہ کون سا عالم ہے کہ دل میں تاباں
زلیست تو زلیست ہے اب موت کا ارماں بھی نہیں

پڑوسن

صرف آواز سُنی ہے اُس کی
شب کی تنہائی میں کیا گاتی ہے؟ کیوں گاتی ہے؟ کون کہے؟
زمزمہ سوز بھی ہے ساز بھی ہے
پردۂ راز بھی غمّاز بھی ہے
کتنا غمگین ہے لہجہ اُس کا
درد میں ڈوبا ہوا
ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے
دشت بے آب و گیاہ

اور سڑتی ہوئی گلتی ہوئی لاشیں ہر سمت
چیلیں منڈلاتی ہوئیں۔ پنجے کھولے ہوئے پر تولے ہوئے،
وادیٔ مرگ۔
اجنبی گیت۔ بم وزیر کا اک سیل رواں
جیسے سیاروں کا نغمہ کہ سمجھ بھی نہ سکوں
(کوئی کہتا تھا کہ بنگالن ہے)
ہوگی...... مجھے کیا معلوم ——؟

سوچتا ہوں

رات کے دامن میں ظلمت بھی مہ و پروین بھی
شامِ غم سے مل گئیں صبحِ مسرت کی حدیں
کون جانے میری منزل تیرگی یا روشنی ؟
ٹوٹتے تاروں سے کھیلوں یا سحر کو ساز دوں
عشرتِ بزمِ شبستاں ـــ تلخیٔ کارِ جہاں
موت کو آواز دوں یا زیست کو آواز دوں

زندگی میرے لئے ہے نیش بھی اور نوش بھی
باعثِ آرائشِ محفل ہے یہ حسنِ تضاد
عشق کا سوزِ دروں بھی حسن کی آغوش بھی

فروزاں

رات دن

اک فسانہ سا بنے جاتے ہیں

مختلف باب مگر ایک پلاٹ

—— کبھی یوناں کے غلاموں کی بغاوت کا سماں

—— کبھی پیرس کا کمیون

—— کبھی روسی مزدور

زار کا تختہ اُلٹنے کے لئے تیغ بکف

مختلف باب مگر ایک چارٹ

وہی طبقات کی جنگ

ظالم و مظلوم کی جنگ

جس کی بنیادوں پہ قائم ہے نظام عالم

ایک رُباعی

یہ رات اپنی ہے یہ ماہتاب اپنا ہے
یہیں پہ وقت کا سیلِ رواں ٹھہر جائے
ہمیں بھی چلنا ہی منزل تلک مگر اے کاش
ذرا سی دیر کو یہ کارواں ٹھہر جائے

پلائی آج جو رنگیں لبوں کے ساغر سے
کسی نے ایسی مئے تند و تیز پی ہی نہیں
یہ کہکشاں یہ ستارے گواہ ہیں اے دوست
ترے علاوہ محبت کسی سے کی ہی نہیں

گُناہ! — زندگی بے رنگ ہے بغیر گُناہ
حیاتِ صحنِ چمن معصیت ہے فصلِ بہار
شرابی ہونٹوں کی مخمور الکھڑیوں کی قسم
رواج در سمِ جہاں غرقِ بادۂ گُلنار

ترا شباب ترا حسن تیری رعنائی
کھلیں یہ پھول تو سارا چمن مہک اُٹھے
طرب کی آگ کو بھڑکا دے اور بھڑکا دے
کہ زندگی کی فضائے خنک دہک اُٹھے

موت کی تاریکیوں میں چند لمحوں کے لئے
زندگی کی شمع نورانی جلا سکتا تو ہوں

اس زبوں حالی پہ بھی تاباںؔ بہ فیضِ جام و مے
مسکرا سکتا تو ہوں میں گنگنا سکتا تو ہوں

کون بوجھے یہ پہیلی — حسن یا حسنِ نظر
بزمِ خوباں میں غمِ ہستی بھلا سکتا تو ہوں

کیا غرض شیخ و برہمن کی سیاست سے مجھے
جس کو میں چاہوں خدا اپنا بنا سکتا تو ہوں

میری قسمت میں نہیں جامِ مئے عرفاں تو کیا
اس کے ہونٹوں کے چھلکتے جام پا سکتا تو ہوں
کہکشاں مانا کہ پروازِ تخیّل سے بھی دور
اُس گلی کوچے رہ گذر اپنی بنا سکتا تو ہوں

میں فرشتہ بھی نہیں صوفی بھی مُلّا بھی نہیں
آدمی ہوں آدمی کے کام آسکتا تو ہوں

دیوانے

یہی وحشی یہی سودائی یہی دیوانے
ایک دن معرکۂ شوق بھی سر کریں گے
عشق — ہاں عشق کو سمجھا ہی نہیں ہے تم نے
حسن — ہاں حسن کو پابندِ نظر کریں گے
یونہی جلتے رہے جلتے رہے آہوں کے چراغ
رات کو روکشِ تنویرِ سحر کریں گے

آج خونابہ فشاں اشک چکاں ہیں آنکھیں
کل مگر تکملۂ ذوقِ نظر کریں گے

یہی وحشی یہی سودائی.. یہی دیوانے
محبسِ غم کی فصیلوں کو نگوں کر دینگے
زندگانی کو سکھائیں گے ادا جینے کی
عقل کو تابعِ فرمانِ جنوں کر دینگے
سازِ ایام رواں اور رواں کرلیں گے
لذّتِ سوز فزوں اور فزوں کر دینگے
اِک نہ اِک روز اُلٹ جائیگی فطرت کی نقاب
اہلِ محفل پہ عیاں رازِ دروں کر دینگے

یہی وحشی یہی سودائی یہی دیوانے
ذرّے ذرّے کو ستاروں کی ضیا بخشیں گے
اور آئینۂ ہستی کو جلا بخشیں گے
باغِ عالم میں بہاروں کو بقا بخشیں گے

تلخیاں جیسے فضاؤں میں گھُلی جاتی ہیں

ظلمتیں ہیں کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہیں

آشیانوں کے قریں بجلیاں لہراتی ہیں

زندگی ایک اٹل کوہ گراں ہے لیکن

جس سے بیداد کے شیطان بھی ٹکراتے ہیں

آگ اور خون کے طوفان بھی ٹکراتے ہیں

مُنہ کی کھاتے ہیں پچھڑ جاتے ہیں زک پاتے ہیں

بارِغ عالم پہ ہوئے کتنے خزاں کے یلغار
زندگانی پہ کئی موت نے چھاپے مارے
کبھی یوناں سے کبھی روم سے طوفان اُٹھے
وادیِ نیل سے اُبلا کبھی خونی سیلاب
آگ بھڑکی کبھی آتش کدۂ فارس سے
زندگی شعلوں میں تپ تپ کے نکھرتی ہی گئی
جتنی تاراج ہوئی اور سنورتی ہی گئی

کاٹھگودام سے بھوالی تک......

کتنی پر پیچ ہیں کہسار کی راہیں، ہمدم
کار ہر گام پہ بَل کھاتی چلی جاتی ہے
سینۂ کوہ پہ دَراتی چلی جاتی ہے
کھوئی جاتی ہیں مناظر میں نگاہیں ہمدم

دامنِ کوہ میں وہ ندی کنارے گاؤں
بام و دیوار پہ چھایا ہوا قرنوں کا جمود
زندگی پیٹ کے بَل رینگ رہی ہو جیسے

چیڑ کی چھاؤں میں گاتے ہوئے چشمے کے قریب
جانے کیوں دیر سے بیٹھی ہے پہاڑی لڑکی
ملتجی نظریں ہیں بیگانۂ احساس شباب

....

اُس طرف ایک ستم دیدہ پہاڑی مزدور
بارِ ہستی سے جھکے جاتے ہیں شانے جسکے
ہانپتا کانپتا منزل کی طرف جاتا ہے

....

دُور اُس وادیِ شاداب میں وہ سیب کے باغ
دیکھ کر جن کو خجل ہوتا ہے باغِ رضواں
ان کو سینچا گیا انساں کے لہو سے ہمدموں

کتنی پُر پیچ ہیں کہسار کی راہیں ہمدم
کار ہر گام پہ بل کھاتی چلی جاتی ہے
سینۂ کوہ پہ دراتی چلی جاتی ہے
کھوئی جاتی ہیں مناظر میں نگاہیں ہمدم

پہاڑی گیت

دُور وادی میں کوئی گیت کسی نے چھیڑا
تند آواز اٹھی، گونجی، فضا میں بکھری
تند — جس طرح اُبلتا ہے پہاڑی چشمہ
گونجتا — سنگِ گراں بار سے ٹکراتا ہوا

اپنے اسلاف کی عظمت کہ زمانے کا گلہ
شومئ بخت کہ ابنائے وطن کا شکوہ
ڈیڑھ سو سال کی مجہول سیاست کے نقوش
کس طرح اجنبی ہاتھوں نے کیا ہے تاراج

یہ چمن زار، یہ پُر کیف بہاروں کا وطن
یا کوئی منظرِ رنگیں ــــ کوئی رودادِ عجیب
کسی دوشیزۂ کہسار کا افسانۂ عشق
کون بتلائے کہ اس گیت کا موضوع ہے کیا؟

اراده

یہ تلخیاں، یہ ظلمتیں، یہ شورِ رستخیز
تحلیل ہو چکا ہے فضاؤں میں کتنا درد
بے مہری و جفا کے دھندلکو نکی چھاؤنیں
بازارِ موت گرم ہے بزمِ حیات سرد

ساحل پہ عافیت بھی ہے آسودگی بھی ہے
طوفاں میں گھر گیا ہے سفینہ مگر ندیم

ظلمت کی ان مہیب فصیلوں کے اس طرف
کب سے ہے منتظر ترا نورِ سحر ندیم

ہم آج بڑھ کے توڑ دیں پندارِ موج و باد
یہ بھی ہماری راہ میں حائل نہ ہو سکے
یہ تلخیاں، یہ ظلمتیں، یہ شورِ رستخیز
کوئی بھی حدِ فاصلِ منزل نہ ہو سکے

احساس

سوچتا ہوں تری محفل سے چلا جاؤں میں

رنگ و نکہت کا گراں بار تجمل ڈالے گا

میری حساس طبیعت مری خودداری کو

یہ شبستانِ مسرت — تری اُلفت کی قسم

میری آوارہ مزاجی کو نہ راس آئے گا

جس طرح ساز سے گرتی ہوئی نغموں کی پھوار

اور بھی تشنگیٔ شوق بڑھا جاتی ہے

تیری تابندہ جوانی ترا رخشندہ شباب

اور جذبات کو گمراہ کریں گے اے دوست
زندگی کاکل و رخسار میں کھو جائے گی
نغمۂ و نکہت و انوار میں کھو جائے گی
میرا فن، میرا تخیل، مرے نازک افکار
عیش کی سرد فضاؤں میں ٹھٹھر جائیں گے
گیت — تاروں کے شرارونکے چمن زارونکے
جن کو پہنانا ہے الفاظ کے ملبوس ابھی
تیری آغوش میں گھٹ گھٹ کے وہ مرجائینگے
سازہی ساز ہے محفل تری آغوش تری
زیست گر سوز نہیں کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں
سوچتا ہوں تری محفل سے چلا جاؤں میں

میں سوچتا تھا......

میں سوچتا تھا کہ غم کی سیاہ راتوں میں
ترے جمال کے روشن چراغ بھی ہونگے
میں سوچتا تھا کہ تشنہ لبیِٔ شوق کے ساتھ
نوازشوں کے چھلکتے ایاغ بھی ہونگے
میں سوچتا تھا کہ واماندہ آرزؤں کو
ترے کرم کا سہارا تو مل ہی جائے گا
ہزار شورشِ طوفاں سہی سفینہ کو
تو ناخدا ہے کنارا تو مل ہی جائے گا

میں سوچتا تھا کہ زلفوں کی نرم چھاؤں میں
ستا نہ پائے گی غربت کی دوپہر مجھ کو
رہِ حیات میں جب پیر ڈگمگائیں گے
سنبھال لے گی محبت کی اک نظر مجھ کو

میں سوچتا تھا کہ الفت کے ساز پر دن رات
ترے جمال کے رنگین گیت گاؤں گا
ترے شباب ترے حسن کے تصرف سے
میں اپنے واسطے دنیا نئی بناؤں گا

میں سوچتا تھا ۔ مگر سوچنے سے کیا حاصل
خیال موج سے پیدا نہ کر سکا ساحل

دوسین

(۱)

شاعر نے اک گیت سنایا

بزم پہ جیسے مستی چھائی
پائل چھنکی ــــ ساغر چھلکا
عشق نے لی پھر سے انگڑائی
حسن کے رخ سے آنچل ڈھلکا
دور افق پر تارے ناچے
ہوش ربا نظارے ناچے
دنیا ساری وجد میں آئی

(۲)

شاعر نے اک گیت سُنایا

بزم میں جیسے آگ لگائی
رگ رگ میں بیتاب شرارے
باغی نے تلوار اٹھائی
بہہ نکلے پھر خون کے دھارے
ایوانوں پر لرزہ طاری
سُلطانوں پر لرزہ طاری
دُنیا میں اک آندھی آئی

جب اور اب

مری نگاہ رہی سوئے آسماں جب تک
مرے خیال بھٹکتے رہے فضاؤں میں
مہ و نجوم کو کیا جانے میں نے کیا سمجھا
توہمات کی محفل سجی خلاؤں میں
رہے درود و مناجات تشنہ ہونٹوں پر
پڑھی نماز غم زندگی کی چھاؤں میں
مرے خیال پہ چھائے ہوئے تھے حور و قصور
مرا شمار تھا دنیا کے پارساؤں میں

شعور جاگ اُٹھا میں نے خود کو پہچانا
مجھے زمین نے عرفان و آگہی بخشی

سیاہ تھیں یہ فضائیں بہ وصف ماہ و نجوم
حقیر خاک کے ذرّوں نے رُوشنی بخشی

نیا گداز تمنّا ___ نیا مذاق نظر
جنونِ شوق نے اِک تازہ زندگی بخشی

مرے ضمیر نے میرے شعور نے مجھ کو
خود اعتمادیٔ و خودداری و خودی بخشی

تاج اور تخت کو ٹھوکر ہیں اڑانے کے لئے
ہوتے جاتے ہیں کمر بستہ بغاوت پہ غلام
خون و فولاد کے بپھرے ہوئے طوفاں بنکر
خواب سے چونکے ہیں کچلے ہوئے دُنیا کے عوام
سرنگوں ہونے ہی والا ہے امارت کا محل
مُفلسی جنگ پہ تیار نظر آتی ہے
کل جو اُٹھتا تھا سلامی کو بصد عجز و نیاز
آج اُس ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے

عالمِ تازہ کے گاؤں میں اُبھر آئے ہیں نقش
اِک نئی زندگی شہروں میں جنم لیتی ہے
شب کی وادی میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
صبحِ مشرق کے جھروکے سے صدا دیتی ہے
قیدِ اوہام سے آزاد ہوئے فکر و نظر
جل اُٹھے تیرہ و تاریک دماغوں میں چراغ
آخرش چاند ستاروں میں بھٹکنے والے
پا گئے خاک کے ذرّوں ہی میں منزل کا سُراغ

آج آتا ہے نظر بزم کا انداز نیا
لے نئی ۔ راگ نیا ۔ گیت نیا ۔ ساز نیا

"۱۵ر اگست سنہ ۱۹۴۷ء"

مغربی شیطنت کے چہرہ پر
دیکھ اپنے لہو کا غازہ ہے
تین صدیاں گزر چکیں لیکن
زخم سینہ کا اب بھی تازہ ہے

کس سے شکوہ کریں ہم اپنوں کا
گرتے گرتے سنبھل گیا دشمن
دے کے ہم کو فریب آزادی
اک نئی چال چل گیا دشمن

جسم پہلے سے قید تھا لیکن
رُوح پر اُس نے دام پھینکدیا
آچکا تھا جو تشنہ ہونٹوں تک
ہم نے خود ہی وہ جام پھینکدیا

رات کی واژگوں فصیلوں کے
اُس طرف منتظر سویرا تھا
"دولتِ مشترک" کے شیدائی
اپنی قسمت ہی میں اندھیرا تھا

اپنے پاؤں میں بیڑیوں کے عوض
پڑ رہی ہیں طلائی زنجیریں
تابناک و حسین خوابوں کی
رُوح فرسا ہیں کتنی تعبیریں

"میرے دوست"

ترے شاعرانہ تخیل کا مسکن

شفق کے خیاباں ستاروں کے گلشن

ارم کی بہاریں — ہما کا نشیمن

فلک پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے

توہم کی محفل سجائے ہوئے ہے

حقائق سے دامن بچائے ہوئے ہے

ستاروں سے آگے جہاں ڈھونڈتا ہے

سرابوں میں آبِ رواں ڈھونڈتا ہے

کہاں زندگی ہے، کہاں ڈھونڈتا ہے

زمیں سے گریزاں زماں سے گریزاں

جوانوں کے عزمِ جواں سے گریزاں
ہر اک منظرِ خوں چکاں سے گریزاں

مرے دوست لفظوں کا طومار کب تک

زبوں کوشیٔ فکرِ بیمار کب تک
مذاقِ تغیّر سے انکار کب تک

زمانہ پہ جیسے شباب آرہا ہے

سحر در جلو آفتاب آرہا ہے
فضا سُرخ ہے انقلاب آرہا ہے

اِنڈونیشیا

ایک گرتے ہوئے ساتھی نے پکارا ہے مجھے
دورِ مشرق کے خیابانوں سے
آج آہوں کی کراہوں کی صدا آتی ہے
رخصت اے جانِ تمنّائے حزیں
الوداع
اس کا دُشمن بھی وہی ہے جو مرا دُشمن ہے
تین صدیوں کا پُرانا دُشمن
جس کے دامن پہ ابھی تک ہے جوانوں کا لہو
سرفروشوں کا شہیدوں کا لہو

آج اُس خون کا بدلہ مجھے لے لینے دے
زنگ خوردہ سہی تلوار مری
میرے بازو میں تو قوت ہے ابھی
میری رگ رگ میں رواں خونِ شجاعت ہے ابھی
میرا گُل رنگ نشاں
جس نے مشرق کے شبستاں کو ضیا بخشی ہے
آج رہبر ہے مرا
میری تلوار ابھی پیاسی ہے
چاٹ لینے دے اسے مغربی کتّوں کا لہو

پڑ گئے شب کی فصیلوں میں شگاف
جن سے انوارِ سحر جھانک رہے ہیں اے دوست
اور اک آخری وار
آج ظلمت کی فصیلوں کو نگوں سر کر دیں
یوں مٹا ڈالیں کہ ہلکا سا نشاں بھی نہ رہے

ایشیا آج ہے اِک محبسِ سنگین و وسیع

ایشیا رشکِ گلستاں ہو جائے!

ایشیا شمعِ شبستاں ہو جائے!!

ایشیا ضامنِ آزادیٔ انساں ہو جائے!!!

رُخصت اے جانِ تمنّائے حزیں

الوداع

میں کس سے انتقام لوں ـــ

یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے سُرخ ہوگئی زمیں
مصیبتوں کی داستاں میں سُن چکا ہوں ہمنشیں
میں سُن چکا ہوں کس طرح بزرگ و ناتوان بھی

بلکتے شیر خوار بھی فسردہ نوجوان بھی
اجل کے گھاٹ ایک ایک کر کے سب اُتر گئے
گھروں کی شاہزادیاں ـــ حریم ناز کی مکیں
(جو عفتیں گنوا چکیں ـــ جو عصمتیں لُٹا چکیں)
بھٹک رہی ہیں در بدر

برہنہ پا — برہنہ سر

میں سُن چکا ہوں ہمنشیں یہ داستان دلخراش
مگر کسے میں دوش دوں
میں کس سے انتقام لوں

تباہیوں کی گود کے پلے ہوئے کسان سے ؟
کہ جنگِ انقلاب کے سپاہی ۔ نوجوان سے ؟
غریب و ناتوان سے ؟
نہیں نہیں !!
یہ سب مرے عزیز ہیں — یہ سب مجھے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں
بتا کسے میں دوش دوں

چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں
اِک اجنبی سفید ہاتھ — آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرۂ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

صبحِ کاذب

مسکنِ ظلمت کو تنویروں کا گھر سمجھا تھا میں
صبحِ کاذب تھی مگر تابانِ سحر سمجھا تھا میں

خونِ انسانی سے دامانِ اُفق تھا لالہ فام
اور اس سُرخی کو تمہیدِ سحر سمجھا تھا میں

جبر و استبداد کی گرتی ہوئی دیوار کو
قصرِ نو جمہوریت کے بام و در سمجھا تھا میں

لُٹ گیا راہِ طلب میں کاروانِ زندگی
راہزن کو ہائے اپنا راہبر سمجھا تھا میں

موت سے کرنے لگا ہے آج وہ بھی ساز باز
اپنی نادانی سے جس کو چارہ گر سمجھا تھا میں

اصل میں وہ بھی پھنسا تھا سیم و زر کے جال میں
جس کو اب تک ماورائے سیم و زر سمجھا تھا میں

یہ تو سچ ہے زندگی میں انقلاب آیا مگر
اس تغیّر کو بہ عنوانِ دگر سمجھا تھا میں

اس سیہ خانہ کو ذرّوں نے جو دی تھی روشنی
اُس کو تابانیٔ بخششِ مہر و قمر سمجھا تھا میں

نذرِ عقیدت

(کامریڈ بھاردواج کی شہادت پر)

ساتھیو غم نہ کرو

اُس شہیدِ ستم و جور کا ماتم نہ کرو

لب کو آلودۂ نالہ نہ کرو — چشم کو پُرنم نہ کرو

اشک و نالہ مجھے مرغوب نہیں

اِک سپاہی کے لئے آہ و فغاں خوب نہیں

شعلۂ گُل کو بجھا سکتی ہے شبنم لیکن

اِس سے بھڑکے ہوئے شعلے بھی کہیں بجھتے ہیں —؟

اُس کا تابندہ ہو
جس نے زنداں کی فصیلوں کو کیا ہے رنگیں
ضامنِ فصلِ بہار ——!
ضامنِ صبحِ نگار ——!!
ضامنِ عہدِ درخشانِ جہانِ بیدار ——!!!
اِک نئے دور کا تاریخ میں آغاز ہوا
ہو رہا ہے مترتب جو تلنگانہ کے میدانوں میں
اور کلکتہ کے مدراس کے بازاروں میں
کارخانوں کے دفاتر کے جنوں زاروں میں
ساتھیو آگے بڑھو
جل چکیں کشتیاں —— اب کوئی نہیں راہِ فرار
بڑھ کے دشمن پہ کرو آخری وار
اور اس دورِ درخشاں کو مکمّل کر دو

موڑ

پسِ حجاب ابھی تک ہیں کتنے نظارے
اُفق کے پار ہیں رقصاں ہزار سیّارے

قدم بڑھا ذرا جلدی قدم بڑھا ہمدم
کہ کاروانِ تمنّا ہے سُست گام ابھی
جبینِ مہر پہ چھائی ہے ظلمتوں کی گرد
نگارِ صبح میں غلطاں ہے رنگِ شام ابھی
بہارِ لالۂ و گل ہے خزاں بدوش ہنوز
مذاقِ بال و پری ہے اسیرِ دام ابھی

حیات آج بھی زحمت کشِ حدود و قیود
خرد بھی خام ابھی ہے جنوں بھی خام ابھی
ہزار صدیوں نے چھوڑے ہیں رنگا رنگ نقوش
مگر فسانۂ ہستی ہے ناتمام ابھی

نیا جہان۔ نئی زندگی۔ نیا انساں
زمیں پہ کرنا ہے جنت کا اہتمام ابھی

یہ میں نے کب کہا ہمدم کہ رات ختم ہوئی
مگر اُفق پہ چمکتا ہے صبح کا تارا
پلی تھی تیرگیِ یاس جن کے دامن میں
وہی فضائیں ہیں نورِ عمل کا گہوارہ
وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے آج مشرق میں
جو انقلاب کہ کل تک فقط تھا اِک نعرا
بھڑک کے شعلہ جوالہ بن گیا آخر
دبا ہوا تھا تہِ خاک کوئی انگارا

رگوں میں کھولتا لاوا ـــ نگاہ میں بجلی
چڑھا ہوا ہے مزاجِ عوام کا پارا
ملوکیت کی ہوں یا قومیت کی دیواریں
نہ رُک سکے گا کسی سے یہ تیز رَو دھارا
جو کرتے آئے غلاموں کے خوں سے گلکاری
ہُو سے ان کے ہے رنگین ایشیا سارا
اِدھر تو دیکھ خزاں کا وہ دَور ختم ہوا
چمن چمن ہے بہاروں کا سُرخ نظارا

سوادِ مرگ میں آخر حیات ڈھونڈ ہی لی
گُناہ گاروں نے راہِ نجات ڈھونڈ ہی لی

دیوالی

وقار رُوح کے تاروں کو کیوں چھوا تم نے

تمھاری نظم 'دیوالی' بہت ہی اچھی ہے

مگر — یہ رات کی گردن میں دیپ مالائیں

سیاہیوں میں اُجالے کے بد نُما دھبّے

غریب حبشی کو جیسے جُذام ہو جائے

یہ ٹمٹماتے دیے —

یہ ٹمٹماتے دیے صبح کا بدل تو نہیں

میں سوچتا ہوں کہ اس رات چین و برما میں
کسی محاذ پہ کتنے دیے جلے ہوں گے
جوان خون کی ہر بوند اک کرن بن کر
اِک ایسی صبح کی تشکیل کر رہی ہو گی
ہزار صدیوں کی تاریک و تیرہ راتوں میں
بنی رہی ہے جو انساں کے خواب کا مرکز
وہ صبح دُور نہیں
اندھیری رات کے سینہ سے نور کا چشمہ
اُبلنے والا ہے

یہ ٹمٹماتے دیے ــــ لکشمی کے چرنوں میں
سبھی نے حسنِ عقیدت کے پھول ڈالے ہیں
وہ جن کو لکشمی دیوی سے قرب خاص نہیں
گھروں میں اپنے بھی دیپک جلائے بیٹھے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں کو سجائے بیٹھے ہیں

کہ اس طرف بھی عنایت کی اِک نظر ہو جائے
مگر وہ بھولتے ہیں
شکستہ جھونپڑیوں ــــ ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں
کبھی بھی لکشمی دیوی نہ مسکرائے گی
کبھی بہار نہ ان کے چمن میں آئے گی
اگر وہ خود ہی نظامِ چمن نہ بدلیں گے

سیاہیوں کے نمائندے ــــ رات کے بیٹے
ہمارے فکر و تخیل کو باندھنے کے لئے
توہمات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی کبھی شب برات آتی ہے

قید کرنے والوں سے

یہ سنگین فصیلیں

یہ فولاد کے سینچے — یہ سلاسل

مرے جسم کو قید کرلیں

مگر میرے فکر و نظر کی اسیری تو ممکن نہیں ہے

مرا ذہن آزاد ہے!

مرے ہونٹ آزاد ہیں!!

مرے گیت آزاد ہیں!!!

میں شاعر — میں بزم وفا کا مغنّی

بدلتے ہوئے وقت کی چھاؤں میں

اپنے ٹوٹے ہوئے ساز پر

گیت گاتا رہا ہوں

گیت گاتا رہوں گا

مرے زمزمے ــــ کل بھی آزاد تھے

آج آزاد ہیں ــــ کل بھی آزاد ہوں گے

کس کی ہمت

جو نغموں کو بیڑی پہنا دے

کس کی جرأت

جو مطرب کے ہونٹوں پہ تالا لگا دے

کس کی طاقت

جو فنکار کے ذہنِ آزاد کو

غلامی کی پھر پستیوں میں گرا دے

نشیمن میں ہوں یا قفس میں

مرا ذہن آزاد ہے!

مرے ہونٹ آزاد ہیں!!

مرے گیت آزاد ہیں!!!

جیل میں کسی کا خط پاکر

فصلِ بہار میں بھی اسیرِ قفس ہوں میں
گلزار کی فضا کو مرا انتظار ہے

رنگِ فریب کوش کو ہے میری جستجو
بوئے گریز پا کو مرا انتظار ہے

تکتے ہیں میری راہ خیابان کیف خیز
دشتِ جنوں فزا کو مرا انتظار ہے

جیسے فسردہ ہو گئی بزمِ صدا و ساز
یارانِ خوشنوا کو مرا انتظار ہے

سونے پڑے ہیں منبر و محراب میکدہ
رندانِ باصفا کو مرا انتظار ہے

اے دوست غم کے گہرے اندھیرے میں آج بھی
اک اخترِ وفا کو مرا انتظار ہے

یہ اور بات ہے کہ وہ منہ سے نہ کہہ سکے
اس پیکرِ حیا کو مرا انتظار ہے

ہیں میرے انتظار میں گیسوئے شام خیز
چشمِ سحر نما کو مرا انتظار ہے

اب بھی کھُلا ہے بابِ اِرم میرے واسطے
اب بھی مرے خدا کو مرا انتظار ہے

جو میرے انتظار میں ہیں ان کو کیا خبر
تہذیب وارتقا کو مرا انتظار ہے

اُٹھتی ہیں بار بار نگاہیں مری طرف
جمہورِ ایشیا کو مرا انتظار ہے

شعر و شراب و نغمہ و رومان تابہ کے
اب عرصۂ وغا کو مرا انتظار ہے

غزل

سوچتا ہوں میں اتنا کہہ دوں راج کے ذمّہ داروں سے
وقت کا دھارا موڑ نہ پایا کوئی بھی تلواروں سے

وحشی آخر وحشی ہیں آدابِ اسیری کیا جانیں
آج بھی وہ مانوس نہیں ہیں زنداں کی دیواروں سے

فطرت سے اے دوست مجھے اعزازِ تلمذ حاصل ہے
میں نے تو آوارہ گردی سیکھی ہے سیّاروں سے

یاس کے عالم میں بھی رہا ہے آس کا دامن ہاتھوں میں
گھور اندھیری راتوں میں مَیں کھیلا ہوں مہ پاروں سے

کشتی ــــ وہ کشتی جو توڑے موجوں کا پندارِ جنوں
مانجھی ــــ وہ مانجھی جو ٹکرّ لے طوفانی دھاروں سے

غزل

یہ جونکیں! یہ انساں کا لہو چوسنے والے
کچھ فرق نہیں ایک ہیں گورے ہوں کہ کالے

حق بات کے اعلان کی پاداش میں دیکھیں
کتنوں کو ابھی پینا پڑیں زہر کے پیالے

مطلب ہے نہ کچھ سوچیں۔ نہ سمجھیں نہ کہیں ہم
پہرے ہیں خیالوں پہ زبانوں پہ ہیں تالے

ہم اپنی زباں میں اسے مانجھی نہیں کہتے
کشتی کو جو کر دیتا ہے طوفاں کے حوالے

کپڑے تو نہیں میرے عقائد کہ بدل دوں
سو بار اگر چاہے کوئی جیل میں ڈالے

صیحت جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہی شئے ہے
بیمار لیا کرتا ہے آخر میں سنبھالے

آکاش پہ تاروں کی لویں کانپ رہی ہیں
چھننے لگے مشرق کی فضاؤں سے اُجالے

نزدیک ہے نزدیک وہ ہنگام کہ جسدم
گیتوں میں بدل جائینگے تاباںؔ ترے نالے

غزل

انسان کے خوابوں کی تاباں تعبیر اُبھرتی آتی ہے
اِک عالمِ تازہ کی جیسے تصویر اُبھرتی آتی ہے

اے کاش اُسے پڑھ سکتے وہ ہیں بند ابھی جنکی آنکھیں
دیوارِ زمانہ پر جو کچھ تحریر اُبھرتی آتی ہے

جس جا پہ شہیدوں کے خوں کی اک بوند گری تھی کل ساتھی
دیکھا بھی ہے تو نے آج وہاں شمشیر اُبھرتی آتی ہے

ظلمات کا افسوں ٹوٹ چکا مدقوق ستارے ڈوب چلے
تاریک اُفق کے دامن پر تنویر اُبھرتی آتی ہے

تقدیر کی خواب آلودہ اور تاریک فضاؤں سے جیسے
خورشیدِ درخشاں کی صورت تنویر اُبھرتی آتی ہے
زنجیر ہمیں پہناتے تھے جو کل تک اُنکے ذہنوں میں
یہ کیسا تغیر ہے تاباںؔ زنجیر اُبھرتی آتی ہے